شبلی کی سیرت النبیؐ کا مطالعہ نقد سلیمانی کی روشنی میں

ڈاکٹر محمد یٰسین مظہر صدیقی

علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے عظیم و محبوب استاذ علامہ شبلی نعمانی کی آخری تصنیف "سیرت النبی" کی نہ صرف جمع و تدوین کی خدمت انجام دی، بلکہ اس کی ترتیب و تہذیب اور تکمیل کا عظیم علمی کارنامہ بھی انجام دیا۔ لائق شاگرد نے اپنے مرحوم استاذ کی آخری وصیت کو اپنی پوری زندگی کا لائحہ عمل بنالیا اور ایک طرح سے اپنی زندگی کو سیرت نبوی کے لیے وقف کردیا۔ علامہ ندوی کو استاذ سے بیکراں عقیدت و محبت کے ساتھ اپنے فرض کے تقاضوں کا بھی پورا احساس تھا، چنانچہ اپنے دیباچۂ طبع چہارم میں فرماتے ہیں:۔

"نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات کے بعد جب سیرت کا مسودہ مصنف کی وصیت کے مطابق اس ہیچمدان کے ہاتھ آیا تو اس عقیدت کی بنا پر جو ایک شاگرد کو اپنے استاذ سے ہونی چاہیے، استاذ کے مسودہ پر انگلی رکھتے ہوئے بھی ڈر معلوم ہوتا تھا۔ اگر کبھی بہ ضرورت ایسی گستاخی کرنی پڑتی تھی تو خواب میں بھی ڈر جاتا تھا....."[1]

لیکن مدتوں شاگرد جامع کا احساسِ دیانت اپنے استاذ کے علمی رعب اور عظمت کے نیچے دبا رہا اور "مبیضہ کا مقابلہ مسودہ سے اور نہ مسودہ کا مقابلہ اصل ماخذوں سے میں نے کیا، بلکہ مصنف کی امانت جوں کی توں ناظرین کے سپرد کردی"[2] لیکن طبع چہارم سے پہلے تقابل اور مطابقت کا خیال آیا اور تلاش بسیار، محنت شاقہ اور تفحص شدید کے بعد کتاب پھر مرتب کی گئی۔ "کچھ مقام ایسے بھی تھے جہاں اس ہیچمدان جامع کو مصنف کے نظریے سے

اختلاف تھا، اس دفعہ وہاں حاشیے بڑھا کر اختلاف کو ظاہر کر دیا، کہیں کسی واقعہ کے اجمال کی تفصیل یا دفع شبہ کی ضرورت تھی، وہاں اس ضرورت کو پورا کیا گیا بعض مسامحات پر تنبیہ مناسب تھی وہ کی گئی، کہیں فروتر ماخذ کا حوالہ تھا اور اثنائے مطالعہ میں اس سے بالاتر ماخذ ملا تو اس کا حوالہ دے دیا گیا۔"[۱۲]

علامہ ندوی کو یہ احساس بھی تھا کہ "خطائے بزرگان گرفتن خطا است" لیکن ساتھ ہی "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کا ربانی فرمان بھی پیش نظر تھا جس نے فروگذاشتوں اور خامیوں پر تنبیہ کا فریضہ انجام دینے پر انھیں مجبور کیا۔ "سیرت النبیؐ" کے بار بار مطالعے کے دوران اس خاکسار تبصرہ نگار کو سلیمانی استدراکات اور تنقیدی اشارات کی علمی اہمیت کا اندازہ ہوا اور خیال آیا کہ ان کو ایک مضمون کی شکل میں مرتب کر دیا جائے تاکہ بعض اہم علمی امور پر دو عظیم عالموں اور صاحب نظر محققوں کی تحقیقات اور نظریات اہل علم کے سامنے یکجا آسکیں اور آج کے جمود زدہ کو رذوق اور تقلید پرستوں کی آنکھیں کھل سکیں جو شخصیت پرستی کے اندھیروں میں صحیح اور تعمیری تنقید کی اہمیت کو نہیں پہچانتے یا پہچاننا اور سمجھنا نہیں چاہتے۔

سید صاحب مرحوم کے زیادہ تر استدراکات کا تعلق سیرت النبیؐ کی جلد اول سے ہے اور اس کی بدیہی وجہ یہی معلوم ہوتی ہے کہ اسی کا مواد مصنف مرحوم نے اپنی زندگی میں مرتب ومبیض کر لیا تھا۔ دوسری جلد میں زیادہ تر مواد جامع ندوی کے اضافوں کی شکل میں ہے۔ ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ جلد اول میں تاریخی اور علمی مباحث زیادہ ہیں اور ان کے تناسب سے اختلافات کی گنجائش قدرے زیادہ تھی۔ باقی جلدیں سید ندوی کی اپنی علمی کاوشیں ہیں جن میں مصنف اول اور استاد شبلی سے اختلاف کے حوالے کہیں کہیں صراحتاً یا ضمناً مل جاتے ہیں اس مضمون کی تنقیدی ومبصرانہ جولان گاہ صرف پہلی دو جلدوں تک محدود ہے کہ ان ہی میں استاذ وشاگرد کی مشترکہ کاوشیں جلوہ گر ہیں۔

علامہ شبلی پر پہلی سلیمانی تنقید اور تشریح تبصرہ کمالات وصفات انبیاء کے باب میں شروع کتاب میں نظر آتا ہے۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ..... (زمانے نے) "اس قسم کے نفوس قدسیہ جو پیش کیے ہیں، وہ فضائل اخلاق کی کسی خاص صنف کے نمونے تھے مثلاً

جناب مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مکتبِ درس میں صرف حلم و تحمل، صلح و عفو، قناعت و تواضع کی تعلیم ہوتی تھی، حکومت و فرمانروائی کے لیے جو فضائلِ اخلاق درکار ہیں مسیحی تعلیم کی بیاض میں ان سطروں کی جگہ سادی ہے۔ حضرت موسیٰ اور نوح علیہما السلام کے اوراقِ تعلیم میں عفوِ عام کے صفحے خالی ہیں۔ اس بنا پر ہر ہر قدم پر نئے نئے رہنما کی ضرورت پیش آئی اور اس لیے عالمِ انسانی اپنی تکمیل کے لیے ہمیشہ ایسے جامع کامل کا محتاج رہا جو صاحبِ شمشیر و نگین بھی ہو اور گوشہ نشین بھی، بادشاہ کشور کشا بھی ہو اور گدا بھی، فرمانروائے جہاں بھی ہو اور سبحہ گرداں بھی، مفلس قانع ہو اور دریادل بھی۔[۵۴] گویا شبلی مرحوم نے تمام انبیائے سابقین کو کسی ایک خاص صنفِ اخلاق سے متصف مانا ہے اور ختم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کو جامع صفات و کمالاتِ نبوت۔ سید مرحوم نے تشریح کرتے ہوئے تنقید کی ہے کہ "یہاں پر کتاب کی اس عبارت بالا کے مخاطب اہلِ کتاب ہیں جن کے موجودہ صحیفوں میں ان انبیاء کے جو احوال مذکور ہیں وہ اسی صورت میں ہیں۔ اس لیے مصنف نے ان کے بیان کردہ تمام احوال کو مان کر ایک باکمال اور ہمہ کمال ہستی کی ضرورت پر ان کے سامنے حجت قائم کی ہے۔ لیکن چونکہ ازروئے اسلام ایک طرف تمام انبیاء علیہم السلام کی صداقت پر یکساں ایمان لانا اور ان کو تمام پیغمبرانہ کمالات سے متصف جاننا ضروری ہے ..... اس لیے یہ ضروری ہے کہ تمام انبیاء علیہم السلام کو یکساں صادق اور کمالاتِ نبوت سے متصف مانا جائے ..... حضرات انبیائے کرام علیہم السلام تمام کمالاتِ نبوت و فضائلِ اخلاق سے یکساں سرفراز تھے مگر زمانے اور ماحول کے ضروریات اور مصالحِ الٰہی کی بنا پر ان کمالات کا عملی ظہور تمام انبیاء میں یکساں نہیں ہوا ...... اس لیے بوجہ عدمِ ضرورتِ حال ان انبیائے کرام کے بعض کمالات کا عملی ظہور کسی وقت میں نہیں ہوا تو اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ یہ حضرات (نعوذ باللہ) ان کمالات و فضائل سے متصف نہ تھے ..... لیکن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت چونکہ آخری اور عمومی تھی، اس لیے بضرورتِ احوال آپ کے تمام کمالاتِ نبوت آپ کی زندگی میں عملاً پوری طرح جلوہ گر ہوئے ...... یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان جزئی کمالات کے اظہار میں ایسا پہلو نعوذ باللہ پیدا نہ ہونے پائے جس سے دوسرے انبیاء علیہم السلام کی توہین یا کسرِ شان پیدا ہو کہ اس سے ایمان کے ضائع جانے کا خطرہ ہے"۔[۵۵]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس خواب کی، جس میں حضرت موصوف کو اپنے فرزند دل بند حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی قربانی کا امر الٰہی ہوا تھا، جو تشریح و تعبیر علامہ شبلی نے کی ہے علامہ ندوی کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ مصنف مرحوم کا خیال تھا کہ خواب براہیمی عینی نہیں بلکہ تمثیلی تھا۔ اس سے مراد یہ تھی کہ بیٹے کو کعبہ کی خدمت کے لیے نذر چڑھا دیں یعنی وہ کسی اور شغل میں مصروف نہ ہوں بلکہ کعبہ کی خدمت کے لیے وقف کر دیے جائیں..... حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس خواب کو عینی خیال کیا اور بعینہ اس کی تعمیل کرنی چاہی، گو یہ خیال اجتہادی غلطی تھی جو انبیاء سے ہو سکتی ہے..... اس بنا پر گو حضرت ابراہیم علیہ السلام اس فعل سے روک دیے گئے، لیکن خدا نے ان کی حسن نیت کی قدر کی....." علامہ ندوی نے تسلیم کیا ہے کہ مصنف سیرت نے اس مقام پر بعض علماء سلف کی تقلید کر کے حضرت ابراہیم کے اس خواب کو تمثیلی کہا ہے مگر "ہیچمدان جامع کا ذوق اس مقام پر اس واقعہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اجتہادی غلطی ماننے سے ابا کرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام جو محبت الٰہی سے سرشار تھے، خطائے اجتہادی سے نہیں، بلکہ غلبہ شوق اطاعت و محبت میں اس حکم الٰہی کی تعمیل اپنی طرف سے بعینہ و بلفظہ کرنے پر آمادہ ہو گئے..... یہ تشریح ان بعض علماء کے مطابقت میں ہے جو بعض دینی و علمی اسباب کی بنا پر اس کو رویائے تمثیلی سمجھتے ہیں، ورنہ جمہور علماء اس رویا کو عینی ہی سمجھتے ہیں۔"[۱]

خانہ کعبہ کی تعمیر کے ضمن میں علامہ شبلی کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل "دونوں نے مل کر ایک چھوٹے سے چوکھونٹے گھر کی بنیاد ڈالی"۔ مگر علامہ ندوی کا بیان ہے کہ "محققین کے بیان کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی منہدم و بے نشان عمارت کی دوبارہ بنیاد اٹھا کر بلند کی"۔ جامع سیرت نے اس مسئلہ پر سیرت النبی کی جلد پنجم باب حج عنوان مکہ اور کعبہ میں سیر حاصل بحث کی ہے اور اس کا یہاں حوالہ بھی دیا ہے۔[۲]

سیرت و تاریخ کے ابتدائی اور قدیم مآخذ میں بعض فصحائے عرب کے خطبات اور شاعری کے نمونوں پر بحث کرتے ہوئے علامہ شبلی نے ان میں سے اکثر کو موضوع قرار دیا ہے۔ اسی کی تشریح میں وہ مزید فرماتے ہیں کہ "ابوطالب کے نام سے جو لامیہ قصیدہ ابن ہشام وغیرہ

نے نقل کیا ہے سر تا پا موضوع ہے"۔ علامہ ندوی کا خیال ہے کہ "اس قصیدہ کو سر تا پا موضوع کہنے کے بجائے، جیسا کہ مصنف نے کہا ہے، اکثر کہنا صحیح ہے کیونکہ اس کے دو شعر صحاح میں بھی مذکور ہیں مثلاً صحیح بخاری و صحیح مسلم، باب الاستسقاء، خود ابن اسحاق نے اس قصیدہ کو نقل کر کے لکھا ہے کہ وبعضُ اھلِ العلم بالشعر ینکرا کثرھا (یعنی بعض ماہرین شعر اس کے اکثر اشعار کی صحت سے انکار کرتے ہیں)" ۵۸

علامہ شبلی اور ان کے لائق شاگرد کے نزدیک ایک دلچسپ اختلاف حضرت علی رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کی مشہور عام روایت کے بارے میں ہے: "چند روز بعد آپ نے حضرت علیؓ سے کہا کہ دعوت کا سامان کرو۔ یہ درحقیقت تبلیغ اسلام کا پہلا موقع تھا۔ تمام خاندان عبدالمطلب مدعو کیا گیا۔... آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانے کے بعد کھڑے ہو کر فرمایا کہ 'میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین اور دنیا دونوں کی کفیل ہے اس بارِ گراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا'، تمام مجلس میں سناٹا تھا۔ دفعۃً حضرت علی نے اٹھ کر کہا: 'گو مجھ کو آشوبِ چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں اور گو میں سب سے نو عمر ہوں، تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا"۔ علامہ ندوی نے اپنے مختصر ترین حاشیے میں تشریح و تنقید کی ہے کہ "طبری نے ..... عبدالغفار بن قاسم اور منہال بن عمرو کے واسطے سے اس کو روایت کیا ہے۔ پہلا شیعی اور متروک ہے اور دوسرا بد مذہب۔ اس روایت میں اور بھی وجوہِ ضعف، بلکہ وجوہ وضع ہیں" ۵۹ افسوس کہ علامہ ندوی نے اپنے تبصرہ و تنقید کو مختصر اشارہ تک محدود رکھا ہے، ورنہ سیرتِ نبوی تبلیغ اسلام اور اس سے زیادہ خاندانِ طالبی کے اسلامی کارناموں اور حمایت و نصرتِ رسولِ کریمؐ کے ضمن میں ہمارے جانبدار مورخین کی مبالغہ آرائی کا مزید ثبوت ملتا۔

"تلک الغرانیق العُلیٰ" والے واقعہ پر علامہ شبلی نے عالمانہ بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حرم میں ایک دفعہ نماز ادا کی، کفار بھی موجود تھے جب آپ نے یہ آیت پڑھی ومنٰوۃ الثالثۃ الاخریٰ تو شیطان نے آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلوا دیے..... اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے سجدہ کیا تمام کفار نے آپ کی متابعت کی"۔ شبلی نے اس پورے قصہ کو بیہودہ اور ناقابل ذکر قرار دیا ہے۔ مگر سید ندوی

نے "اس روایت کے آخری حصہ کو کہ چند کافروں کے سوا تمام جن وانس نے حضور کے ساتھ ایک دفعہ سجدہ کیا" صحیح قرار دیا ہے۔ اور نہ صرف قوسین میں اپنے خیال کو ظاہر کیا ہے بلکہ صحیح بخاری کے باب کی روایت سے سند بھی پیش کی ہے[۴۱]

سیرت نبوی اور تبلیغ اسلام کی تحریک کا ایک اہم مباحثہ "اسلام ابی طالب بن عبدالمطلب ہاشمی" ہے جو دو مختلف مکاتب فکر، مدارس خیال بلکہ عقائد مذہب کی الگ الگ ترجمانی کرتا ہے۔ شبلی نے ابوطالب کی وفات کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے شفیق ومحبوب چچا سے ان کے بوقت مرگ کلمۂ شہادت پڑھنے کی درخواست کی تاکہ آپ بروز قیامت ان کے ایمان واسلام کی گواہی دے سکیں۔ مگر ابوطالب ہاشمی نے ابوجہل مخزومی اور عبداللہ بن ابی امیہ مخزومی کی سرزنش وتوبیخ پر جو کہ اس وقت بستر مرگ ابی طالب کے پاس موجود تھے نہ صرف کلمۂ شہادت پڑھنے سے انکار کیا بلکہ عبدالمطلب ہاشمی کے دین پر مرنے کا اقرار مزید کیا۔ اور پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر کہا: "میں وہ کلمہ کہہ دیتا لیکن قریش کہیں گے کہ موت سے ڈر گیا" آپ نے فرمایا "میں آپ کے لیے دعائے مغفرت کروں گا جب تک کہ خدا مجھ کو اس سے منع نہ کردے"۔ شبلی نے اس کو بخاری اور مسلم کی روایت کہا ہے، پھر ابن اسحاق کی روایت مزید بیان کی ہے جس کے مطابق ابوطالب نے بروایت حضرت عباس بن عبدالمطلب ہاشمی موت کے وقت وہی کلمہ کہہ دیا تھا۔ شبلی نے تسلیم کیا ہے کہ زیادہ تر محدثین ابوطالب کے کفر کے قائل ہیں لیکن پھر علامہ موصوف نے بوجوہ معلوم بخاری کی اس روایت پر کلام کیا ہے کہ "محدثانہ حیثیت سے بخاری کی یہ روایت چنداں قابل حجت نہیں کہ اخیر راوی مسیب ہیں جو فتح مکہ میں اسلام لائے اور ابوطالب کی وفات کے وقت موجود نہ تھے ..... اس لیے یہ روایت مرسل ہے ابن اسحاق کے سلسلۂ روایت میں عباس بن عبداللہ بن معبد اور حضرت عبداللہ بن عباس ہیں۔ یہ دونوں ثقہ ہیں لیکن بیچ کا ایک راوی یہاں بھی رہ گیا ہے۔ اس بنا پر دونوں روایتوں کے درجۂ استناد میں چنداں فرق نہیں"۔ اس کے بعد شبلی مرحوم نے بڑے جذباتی انداز اور رومانی لہجے میں ابوطالب کی جاں نثاریوں، سرفروشیوں اور قربانیوں کا ذکر کرکے بالواسطہ ان کے قبول اسلام کے

نظریہ کی حمایت کی ہے[۱۱]

اس سلسلے میں علامہ ندوی نے اپنے عظیم استاذ پر دو محاکمے کیے ہیں: اول یہ کہ مکالمات رسولِ کریم وابی طالب کی جس روایت کو پوری طرح سے متفق علیہ قرار دیا ہے سید صاحب قبلہ نے یہ تفریق کی ہے کہ "ابو طالب کا اخیر فقرہ مسلم میں ہے، بخاری میں نہیں"[۱۲] صحیح بخاری کی مذکورہ بالا روایت پر شبلی تنقید پر سلیمانی محاکمہ نسبتاً طویل ضرور ہے مگر ان کے موقف کی وضاحت کے لیے پورا نقل کیے جانے کے لائق۔ فرماتے ہیں: "مصنف کے اس نظریے سے مجھے اتفاق نہیں ہے۔ اس لیے کہ بخاری کی روایت کے اخیر راوی حضرت مسیب ہیں، جو صحابی ہیں ظاہر ہے کہ صحابی کی روایت کسی صحابی ہی سے ہوگی، اسی لیے مراسیلِ صحابہ حجت ہیں۔ اور ابن اسحاق کی روایت منقطع ہے اور چھوٹا ہوا راوی صحابی نہیں ہے۔ خود ابن اسحاق بھی استناد کا اعلیٰ درجہ نہیں رکھتے۔ اس لیے دونوں روایتوں کو یکساں قرار نہیں دیا جا سکتا۔ علاوہ بریں حضرت مسیبؓ کی اس روایت کی تائید میں خود حضرت عباسؓ کی وہ روایت ہے جو اسی مسیب والی روایت سے اوپر صحیح بخاری میں موجود ہے، جس میں ذکر ہے کہ "حضرت عباسؓ نے دریافت کیا کہ: 'یا رسول اللہ! آپ کے چچا (ابو طالب) کو آپ سے کیا فائدہ پہونچا کہ وہ آپ کی حفاظت کرتے تھے اور آپ کے دشمنوں سے برسرِ پرخاش رہتے تھے؟' فرمایا: 'وہ دوزخ کی آگ میں صرف ٹخنے تک ہیں مگر اس کا اثر بھی دماغ تک پہنچ جاتا ہے۔ اگر میں نہ ہوتا تو وہ دوزخ کے سب سے نیچے طبقے میں ہوتے،' اس سے معلوم ہوا کہ خود حضرت عباسؓ کے علم میں تھا کہ ان کا خاتمہ توحید کے اقرار پر نہیں ہوا۔ اسی مضمون کی روایت حضرت ابو سعید خدریؓ سے بھی ہے جو صحیح بخاری "باب قصة ابی طالب" میں اسی موقع پر موجود ہے۔"[۱۳] مذکورہ بالا تنقیدِ سلیمانی سے فکرِ شبلی اور موقف ندوی کی تو وضاحت ہو جاتی ہے تاہم اس کے اسباب اور عوامل پر روشنی نہیں پڑتی۔ اسے ہم اپنے تبصرہ میں بحث کریں گے۔

مسجد نبوی کی تعمیر اور اذان کی ابتدا مدینہ منورہ میں اسلامی معاشرہ کی تشکیل و ترقی کا ایک اہم مرحلہ ہے۔ مولفینِ سیرت اور جامعینِ حدیث نے اس ضمن میں مختلف اور متعدد احادیث و روایات بیان کی ہیں۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اوقات

نماز کے لیے مسلمانوں کو جمع کرنے کے لیے ایک موزوں طریقے کی جستجو تھی، چنانچہ آپ نے "صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا، لوگوں نے مختلف رائیں دیں... لیکن آپ نے حضرت عمر کی رائے پسند کی اور حضرت بلال کو حکم دیا کہ اذان دیں۔" شبلی مرحوم نے صحاح ستہ کی اور روایتوں سے اپنی واقفیت کا اظہار کیا ہے جن کے مطابق "اذان کی تجویز عبداللہ بن زید نے پیش کی تھی جو انھوں نے خواب میں دیکھی تھی ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو بھی خواب میں وارد ہوا۔ لیکن صحیح بخاری کی روایت کے مقابلہ میں کسی اور روایت کو ترجیح نہیں دی جا سکتی۔" سید سلیمان ندوی تبصرہ فرماتے ہیں کہ "یہ روایت صحیح بخاری کے علاوہ صحیح مسلم، نسائی اور ترمذی میں بھی ہے۔ لیکن تمام روایات کو اور علماء کی تحقیقات کو سامنے رکھنے سے مسئلہ کی صحیح صورت یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت عمر نے دوسرے لوگوں کی رایوں کے مقابلے میں اپنی رائے پیش کی تھی جیسا کہ بخاری والی روایت میں ہے کہ "اولا تبعثون رجلاً ینادی بالصلوٰۃ" کہ ایک آدمی بھیجا جائے جو پکار کر نماز کا اعلان کر دے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے کو پسند فرمایا اور "الصلوٰۃ جامعۃ" کے لفظ سے اس کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بھی اور بعض دوسرے صحابہ نے بھی خواب میں اذان کے مروجہ الفاظ کے ساتھ اذان کو خواب میں دیکھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منجانب اللہ سمجھ کر قبول فرمالیا اور اسی کے مطابق اذان مروجہ جاری فرمائی گئی۔" سید صاحب مرحوم نے اپنی تحقیقات کی تائید میں مختلف احادیث و آثار کے حوالے دیے ہیں بہرحال ان کی تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عمر نے ابتدا میں مروجہ اذان کی تجویز نہیں رکھی تھی۔ یہ بعد کا معاملہ ہے جو حضرت عمر کے بشمول مختلف صحابہ کرام کے علاوہ خود جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کے رویائے صادقہ کے نتیجہ میں وجود میں آیا تھا۔[۱۴]

فکرِ شبلی سے ندوی اختلافِ رائے کا ایک اور معاملہ غزوۂ احد میں حضرت رافع بن خدیج کو جہاد میں شرکت کی اجازتِ نبوی اور اس کے سبب سے متعلق ہے۔ شبلی مرحوم نے مشہور عام روایات کی پیروی میں یہ ظاہر کیا ہے کہ "جاں نثاری کا یہ ذوق تھا کہ نوجوانوں میں سے جب حضرت رافع بن خدیج سے یہ کہا گیا کہ تم عمر میں چھوٹے ہو، واپس جاؤ تو وہ انگوٹھوں

کے بل تن کر کھڑے ہو گئے کہ قد اونچا نظر آئے، چنانچہ ان کی یہ ترکیب چل گئی اور وہ لے لیے گئے۔" سید مرحوم کا تبصرہ ہے کہ "یہ طبری کی روایت ہے، لیکن بعض دوسری ڈاتیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت رافع کو اجازت مل جانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس نوجوانی ہی میں تیر اندازی میں کمال رکھتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ان کا یہ حال معلوم ہوا تو ان کو شرکت کی اجازت دے دی"۔ علامہ ندوی نے اس روایت کی جو زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کئی سندیں بیان کی ہیں اور تاریخی حوالے فراہم کیے ہیں[۱۵]

اسی باب میں استاد و شاگرد کا ایک اور اختلاف شہدائے احد پر نماز جنازہ پڑھنے یا نہ پڑھنے پر نظر آتا ہے۔ علامہ شبلی کا خیال ہے کہ "ان شہداء پر نماز جنازہ بھی اس وقت نہیں پڑھی گئی"۔ علامہ ندوی کا نظریہ و تبصرہ ہے کہ "یہ صحیح بخاری کی روایت ہے، لیکن دوسری کتابوں میں بعض ایسی روایتیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حمزہ پر خصوصیت کے ساتھ اور دوسرے شہداء پر بھی نماز جنازہ پڑھی تھی۔ یہ شہداء ایک ایک کر کے اور بعض میں ہے کہ دس دس کر کے لائے جاتے تھے اور آپ ان پر نماز جنازہ پڑھتے تھے اور حضرت حمزہ کی لاش مبارک پر ہر جماعت کے ساتھ گویا ستر دفعہ یا سات دفعہ نماز ادا کی گئی"۔ جامع و مبصر ندوی نے اپنے بیان کی تائید میں کتب احادیث کے علاوہ مغازی واقدی کے بھی حوالے دیے ہیں[۱۶]

غزوۂ مریسیع میں بنو مصطلق پر مسلمانوں کے حملے کے بارے میں اہل سیر اور محدثین میں اختلاف ہے۔ مورخین اور سیرت نگاروں کا واضح بیان ہے کہ مسلمانوں نے بنو مصطلق کو نہ صرف خبردار کر کے بلکہ اسلام کی دعوت اور صلح کی پیشکش کے بعد حملہ کیا تھا کیونکہ دشمن نے ان کو مسترد ہی نہیں کیا تھا بلکہ باقاعدہ معرکہ آرائی کی تھی جبکہ صحیحین کی روایت ہے "کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو المصطلق پر اس حالت میں حملہ کیا کہ وہ بالکل بے خبر اور غافل تھے اور اپنے مویشیوں کو پانی پلا رہے تھے"۔ علامہ شبلی نے حافظ ابن حجر کی رائے نقل کی ہے کہ صحیحین کی روایت پر سیرت کی روایتوں کو ترجیح نہیں ہو سکتی لیکن پھر

خود محاکمہ کیا ہے کہ "صحیحین کی روایت بھی اصولِ حدیث کی رو سے قابلِ حجت نہیں کہ اس روایت کا سلسلہ نافع تک پہنچ کر ختم ہو جاتا ہے اور جنگ میں شریک ہونا تو ایک طرف، نافع نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا بھی نہ تھا۔ اس لیے یہ روایت اصطلاح محدثین میں منقطع ہے۔" گویا علامہ موصوف نے حدیث کی روایت کو روایتی معیار پر جانچ کر مسترد کر دیا ہے اور بالواسطہ اہل سیر کی روایت کو ترجیح دی ہے۔ علامہ ندوی نے روایتِ بالا کو منقطع قرار دیئے جانے پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "معلوم ہوتا ہے کہ مصنف نے آغازِ سند ملاحظہ فرما کر اس روایت کو منقطع قرار دیا ہے، ورنہ متنِ حدیث کے بعد تصریح ہے کہ "حدثنی بھذا الحدیث عبداللہ بن عمر وکان فی ذلک الجیش" یعنی نافع نے اس روایت کو حضرت عبداللہ بن عمر سے سنا جو اس لڑائی میں شریک تھے..... اس تصریح کے بعد یہ روایت منقطع نہیں رہتی ہے۔" علامہ ندوی نے صحیحین کی روایت کی سند کے بارے میں اپنے استاد گرامی کے تسامح پر گرفت ضرور کی ہے مگر نفسِ مسئلہ پر اپنی واضح رائے دینے سے گریز کیا ہے۔ بظاہر موصوف کا رجحان صحیحین کی روایت کو قبول کرنے کی طرف معلوم ہوتا ہے جبکہ استاذ گرامی اس معاملے میں اہل سیر سے متفق نظر آتے ہیں۔[۱۷]

غزوہ احزاب کے ضمن میں شبلی گرامی فرماتے ہیں کہ محاصرہ اس قدر شدید اور پرخطر ہو گیا تھا کہ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ کوئی محاصرین کی خبر لائے مگر "حضرت زبیرؓ کے سوا اور کوئی صدا نہیں آئی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی موقعہ پر حضرت زبیرؓ کو حواری کا لقب دیا۔" علامہ شبلی نے اس واقعہ کے سلسلے میں کلیتاً صحیحین کی روایت پر اعتماد کر لیا ہے اور دوسری روایات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس پر سید صاحب نے اضافہ و تنقید کی ہے "لیکن ابن ہشام میں اسی موقع پر حضرت حذیفہ بن یمان کا نام ہے۔ اس لیے محدثین میں ان دونوں ناموں کے واقعوں کی تطبیق میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر اور زرقانی نے بدلائل یہ ثابت کیا ہے کہ محاصرین میں سے قریش کی تحقیقِ حال کے لیے حضرت حذیفہ اور بنو قریضہ کی تحقیقِ خبر کے لیے حضرت زبیر گئے تھے۔ یہ تفصیل واقدی اور نسائی نے اپنی روایتوں میں کی ہے۔" شاگرد کے اس اضافہ و نقد سے ظاہر ہوتا

ہے کہ وہ اپنے استاد گرامی کی رائے سے اتفاق نہیں رکھتے [۱۸]

غزوہ خیبر کے بیان میں علامہ شبلی نعمانی فرماتے ہیں کہ "ایک مدت تک لوگ جہاد کو عرب کے قدیم طریقے کے موافق معاش کا ذریعہ سمجھتے رہے۔ اس لڑائی (خیبر) تک بھی یہ غلط فہمی رہی۔ یہ پہلا غزوہ ہے جس میں یہ پردہ اٹھا دیا گیا اور اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ اس لڑائی میں صرف وہ لوگ شریک ہوں جن کا مقصد محض جہاد اور اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔" علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ "یہاں لوگ سے مراد منافقین ہیں۔ یہ لوگ غزوات میں محض غنیمت کی لالچ میں شریک ہوتے تھے، جہاں سخت مقابلہ پیش آئے اور مال غنیمت نہ ملنے کا گمان ہوتا وہاں غزوات کی شرکت سے کتراتے تھے چنانچہ انہی وجوہ سے وہ حدیبیہ میں شریک نہیں ہوئے اور اس پر سورۂ فتح میں اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی ناراضی ظاہر فرمائی اور یہ ارشاد فرمایا کہ آئندہ غنیمت والے غزوہ میں بھی وہ شریک نہ کیے جائیں اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موقعہ پر اعلان فرمایا کہ اس غزوہ میں بھی وہی شرکت کا ارادہ کریں جن کی غرض محض جہاد و اعلاء کلمۃ اللہ ہو، دنیاوی مال و متاع نہ ہو۔" مصنف کی عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ وہاں لوگ سے مراد عام مسلمان ہیں اور روایات و اخبار حدیث و سیرت بھی ان ہی کی موید ہیں جبکہ سید صاحب ارشاد نبوی کا مصداق منافقوں کو سمجھتے ہیں [۱۹]

غزوہ مونۃ میں شریک ہونے والی مسلم فوج کے بارے میں شبلی مرحوم کا خیال ہے کہ وہ "شکست خوردہ" واپس آئی تھی جبکہ علامہ ندوی کا خیال ہے کہ "مصنف نے یہاں ابن اسحاق کی روایت پر اعتماد کر کے اس فوج کو شکست خوردہ لکھا ہے اور ان کی واپسی پر ان سب کو بلا امتیاز فراری ہونے کا مستحق ظاہر کیا ہے لیکن جیسا کہ صحیح بخاری، غزوہ مونۃ میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے از روئے وحی فرمایا کہ پھر اللہ کی ایک تلوار یعنی خالد سیف اللہ نے مسلمانوں کے علم کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ دیا (فتح اللہ علیہم)۔ ارباب سیر اور اہل روایت اور شراح حدیث اس غلبہ یا فتح کی تشریح میں مختلف ہیں..... اس طرح مسلمانوں کی جس فوج کو اپنے اوپر فراری ہونے کا گمان تھا یا مسلمانوں نے ان کو فراری کہا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو تسلی دی کہ نہیں تم فراری

نہیں، بلکہ پھر دوبارہ حملہ کرنے کی نیت سے پیچھے ہٹ آنے والے ہو۔ اس کی مخاطب پوری اسلامی فوج نہیں، بلکہ ان کی فوج کا ایک خاص دستہ تھا جو جلدی کر کے مدینہ چلا آیا تھا۔" علامہ ندوی نے اپنے خیال کی تائید میں حدیث و سیرت کی متعدد کتابوں کے حوالے دیے ہیں اور اس باب میں اپنے استاد محترم کے خیال سے اتفاق نہیں کیا ہے۔[۲۰]

فتح مکہ کے باب میں علامہ شبلی کا بیان ہے کہ "حضرت خالد کو حکم ہوا کہ فوجوں کے ساتھ بالائی حصہ کی طرف آئیں۔" علامہ ندوی اس پر تنقید کرتے ہیں کہ "مصنف نے یہاں حضرت عروہؓ کی روایت لی ہے جو گو صحیح بخاری میں ہے مگر مرسل ہے۔ صحیح و مرفوع روایات جو صحیح بخاری میں ہیں ان کے مطابق صورت حال یہ ہے کہ حضرت خالد مکہ کے زیریں حصہ سے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بالائی حصہ سے مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔"[۲۱] دلچسپ بات یہ ہے کہ اس سلسلے میں مصنف و جامع دونوں نے اہل سیر کی کسی روایت کا کوئی حوالہ نہیں دیا ہے۔

علامہ شبلی غزوۂ حنین کے ضمن میں حنین کا جغرافیہ بیان فرماتے ہیں کہ "حنین مکہ اور طائف کے درمیان ایک وادی کا نام ہے۔ ذوالمجاز عرب کا مشہور بازار اور عرفہ سے تین میل ہے۔ یہ اس کے دامن میں ہے۔ اس مقام کو اوطاس بھی کہتے ہیں۔" علامہ ندوی کا خیال ہے کہ "یہاں مصنف کی عبارت میں کچھ اغلاق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حنین زرقانی کی تصریح کے مطابق مکہ اور طائف کے درمیان عرب کے مشہور بازار ذوالمجاز کے پاس ہے جو عرفہ سے تین میل ہے۔ ابن سعد نے تصریح کی ہے کہ یہ مکہ سے تین دن کے سفر کی مسافت پر واقع ہے۔" اس کے علاوہ اوطاس کے بارے میں علامہ ندوی کی صراحت یہ ہے کہ مصنف نے قاضی عیاض کی رائے اختیار کی ہے[۲۲] لیکن حافظ ابن حجر نے لکھا ہے کہ ابن اسحاق کی تصریح کے مطابق یہ حنین کے علاوہ دیار ہوازن میں دوسری وادی کا نام ہے۔"[۲۳]

اسی غزوہ میں مسلمانوں کو اول اول شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ شبلی نعمانی رقم طراز ہیں کہ "فتح کے بجائے وہلۂ اول میں مطلع صاف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظر

اٹھا کر دیکھا تو رفقائے خاص میں سے کوئی بھی پہلو میں نہ تھا۔" مگر پھر حاشیہ میں صراحت کی ہے کہ ..." اور روایتوں میں چند اصحاب کا ثابت قدم رہنا مذکور ہے۔ ان دونوں روایتوں کی تطبیق یہ ہے کہ یہ دو مختلف وقفوں کے حالات ہیں، راوی نے اپنا مشاہدہ لکھا ہے۔ تفصیل آگے آئے گی۔" سید ندوی تصریح فرماتے ہیں کہ "مصنف نے آئندہ تفصیل کا جو وعدہ کیا ہے وہ پورا نہیں ہو سکا ہے۔ اس لیے تفصیل کی ضرورت ہے۔" اس کے بعد جامع ندوی نے چند باتوں کی تشریح کی ہے جو کئی صفحات پر پھیلی ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ مصنف نے دہلۂ اول میں مسلمانوں کی شکست کی جو روایت تسلیم کی ہے وہ "ابن اسحاق وغیرہ اہل سیر کی رائے ہے لیکن حدیث صحیحہ کا بیان ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کامیابی ہوئی، لوگ غنیمت پر ٹوٹ پڑے۔ دشمن کے تیر اندازوں نے موقعہ پاکر تیر اندازی شروع کر دی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی انتشار اور پراگندگی پیدا ہو گئی ..... دوسری بات یہ ہے کہ شکست کے ظاہری اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس جنگ میں کچھ لوگ محض اس غرض سے شریک ہی ہوئے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکا دیں..." سید صاحب کا خیال ہے یہ لوگ اہل مکہ تھے "جو جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ دل سے نہ تھے ..... تیسری بات یہ کہ ہے کہ پسپائی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جماعت ثابت قدم رہی" ..... بنائے اشتباہ بخاری کی حضرت انس والی روایت ہے جس کے الفاظ یہ ہیں فادبر وا عنہ حتی بقی وحدہ ..... مصنف نے ان الفاظ کو اپنے پیش نظر رکھا ہے۔" جامع ندوی نے اس کے بعد ان متضاد روایتوں میں تطبیق دی ہے اور دوسری مختلف روایات بیان کی ہیں جن میں متعدد صحابہ کرام کے ثابت قدم رہنے کا ذکر ہے اور ان کے ناموں میں اختلاف کی مختلف توجیہات پیش کی ہیں۔ بہرحال مصنف سیرت کو مسلمانوں کی شکست کا دہلۂ اول میں اعتراف ہے جبکہ جامع ندوی کو دہلۂ دوم میں۔[۲۳]

اسی غزوہ کے ضمن میں علامہ شبلی کا بیان ہے کہ شکست کے مختلف اسباب تھے .... فوج میں دو ہزار طلقاء یعنی وہ لوگ تھے جو اب تک اسلام نہیں لائے تھے۔" گویا کہ ان طلقاء مکہ کا مسلمان نہ ہونا بھی باعث شکست تھا سید صاحب نے اس پر تنقید کی ہے کہ "مصنف کا یہ

فقرہ واضح نہیں ہے۔ مقصود یہ ہے کہ گو وہ کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو چکے تھے جیسا کہ عمدۃ القاری ج ہشتم ص۳۵۹ مصر اور شرح مسلم نووی غزوۃ النساء مع الرجال میں ہے لیکن ہنوز وہ تازہ مسلمان تھے، راسخ الاسلام نہیں ہوئے تھے، اس لیے مہاجرین و انصار جیسا استقلال و ثبات ان میں اس وقت تک پیدا نہیں ہوا تھا۔" علامہ ندوی کو یہ تشریح غالباً اس لیے کرنی پڑی کہ دو سطر پہلے مصنف سیرت نے دو ہزار طلقاء مکہ کو جدید الاسلام نوجوان قرار دیا ہے اور پھر ان کے اسلام نہ لانے کا ذکر کیا ہے[۲۴] اور بظاہر یہ دونوں متضاد باتیں ہیں۔

۹ھ میں ایلاء کا واقعہ پیش آیا۔ علامہ شبلی نے اس کے اسباب و علل پر بحث کرتے ہوئے اختتام پر فرمایا "چونکہ ایلاء کی مدت یعنی ایک مہینہ گزر چکا تھا، آپ بالاخانہ سے اتر آئے اور عام باریابی کی اجازت ہو گئی۔" اس سے ذرا قبل مولانا شبلی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت عمر فاروق کے درمیان ایک مکالمہ نقل کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ازواج مطہرات سے علیحدگی فرمائی تھی اور طلاق نہیں دی تھی جیسا کہ عام طور پر مشہور ہو گیا تھا۔ علامہ سلیمان ندوی نے اس پر خاصا کلام کیا ہے: "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بالاتفاق ۲۹ روز بالاخانہ پر تشریف فرما رہے۔ حضرت عمر کا یہ مکالمہ پہلے روز کا واقعہ ہے یا آخر روز کا۔ اس روایت کے جتنے طرق ہیں ان کا ابتدائی ٹکڑا ظاہر کرتا ہے کہ یہ پہلے ہی دن کا واقعہ ہے اور آخر کے الفاظ سے ثابت ہوتا ہے کہ انتیسویں روز کا واقعہ ہے مصنف مرحوم نے آخری فقروں کا لحاظ کیا ہے اور بظاہر اس کو انتیسویں روز کا واقعہ سمجھا ہے لیکن اس بنا پر لازم آتا ہے کہ ۲۸ دن تک گویا حضرت عمر اور صحابہ کو واقعہ ایلاء کی اطلاع ہی نہ تھی، حالانکہ اس کو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔ اس بنا پر محدثین نے یہ تاویل کی ہے کہ اس مکالمہ کا اکثر حصہ پہلے روز کا واقعہ ہے لیکن اترنے کا بیان آخر روز کا واقعہ ہے۔ راوی نے بیچ کا سلسلہ چھوڑ دیا ہے۔۔۔۔" اس کے بعد سید صاحب نے اپنے خیال کی تائید میں بخاری کی ایک روایت پیش کی ہے[۲۵]

اسی برس حضرت ابوبکر صدیق کی امارت میں حج ہوا جسے مولانا شبلی نے حج اکبر قرار دیا ہے اور اپنے قول کی تائید میں متعدد دلائل دیے ہیں۔ علامہ ندوی کا خیال ہے کہ "مصنف نے اس

حج کو حج اکبر کہنے کی جو توجیہہ لکھی ہے، اس کو گو بعض علماء نے اختیار کیا ہے لیکن عام خیال یہ ہے کہ خاص اسی سال کے حج کو حج اکبر نہیں کہا گیا ہے بلکہ ہر حج عمرہ کے مقابلے میں حج اکبر ہے اور عمرہ حج اصغر۔" علامہ ندوی نے اپنی تائید میں روح المعانی کا حوالہ دیا ہے[۲۶]۔ اسی موقع پر سورہ براۃ (توبہ) کی ابتدائی آیات کے زمانۂ نزول اور ان کے اعلان و اظہار پر استاد و شاگرد کے درمیان معمولی سا اختلاف ہے[۲۷]۔

جلد اول کے آخر میں مصنف سیرت نے "غزوات پر دوبارہ نظر" کے عنوان سے غزوات و سرایائے نبوی کے محرکات و عوامل، مقاصد و نتائج کا بڑا عالمانہ تجزیہ کیا ہے۔ اس کے ضمن میں موصوف نے لفظ "غنیمت" کی لغوی تحقیق کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "چونکہ لوٹ میں زیادہ تر بکریاں ہاتھ آتی تھیں اور بکری کو عربی میں "غنم" کہتے ہیں، اس لیے لوٹ کے مال کو عربی میں "غنیمت" کہنے لگے۔" علامہ ندوی نے اس پر یہ مختصر تبصرہ کیا ہے کہ "یہ مصنف کی ذاتی تحقیق ہے جس کی تائید کتب لغت سے ہاتھ نہیں آئی۔"[۲۸]

جلد دوم میں جامع ندوی کے اپنے استاد گرامی سے اختلافات بہت کم نظر آتے ہیں جس کے وجوہ و اسباب کو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔ بہرحال جو دو چار تنقیدیں، تشریحیں اور تبصرے ملے ہیں وہ بھی خاصے کی چیز ہیں اور دونوں بزرگوں کے مختلف نقطۂ ہائے نظر کے ترجمان۔

یمن میں تبلیغ اسلام کے ضمن میں علامہ شبلی رقم طراز ہیں کہ "یمن میں ہمدان سب سے بڑا کثیر التعداد اور صاحب اثر خاندان تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے (۸ھ کے آخر میں) ان کو دعوتِ اسلام دینے کے لیے حضرت خالد کو بھیجا۔ خالد چھ مہینے تک ان کو اسلام کی دعوت دیتے رہے لیکن ان لوگوں نے قبول نہیں کیا۔ بالآخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خالد کو بلا لیا اور حضرت علی کو بھیجا۔ حضرت علی نے ان لوگوں کو جمع کر کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نامۂ مبارک پڑھ کر سنایا اور ساتھ ہی سارے کا سارا قبیلہ مسلمان تھا..."

علامہ ندوی تبصرہ فرماتے ہیں کہ "اصل واقعہ بخاری جزء غزوات میں موجود ہے لیکن ہمدان کی اس میں تخصیص نہیں اور نہ ان کے اسلام کا اس میں ذکر ہے۔" اس کے بعد علامہ ندوی نے اپنے استاد کی اس تشریح و تصریح سے اتفاق کیا ہے کہ اس واقعہ کے متعلق اور بھی روایتیں

ہیں لیکن وہ صحیح نہیں ہیں۔ بہر حال قبیلہ کے نام پر استاد و شاگرد میں اختلاف کے باوجود دونوں کا اس پر اتفاق ہے کہ یمن کے ان باسیوں نے حضرت علی کے ذریعہ ہی ہدایت پائی تھی اور حضرت خالد کی مہم ناکام رہی تھی۔[۲۹]

فرضیت نماز اور معراج نبوی کے بارے میں استاد گرامی کا خیال ہے کہ "معراج میں جو نبوت کے پانچویں سال ہوئی پانچ وقت کی نمازیں فرض ہوئیں"۔ مگر علامہ ندوی کا خیال ہے کہ "ہماری تحقیق میں معراج نبوت کے نویں سال ہوئی"۔ دونوں بزرگ مصنفین سیرت نے اس باب میں اپنے اپنے دلائل سے آگاہ نہیں کیا ہے۔[۳۰]

آیات میراث کے نزول کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے علامہ شبلی فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن ربیع کا واقعہ اس کا اصل سبب تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا خیال ہے کہ ان آیات قرآن کی شان نزول کے سلسلے میں احادیث میں تین واقعے مروی ہیں: ایک حضرت جابر کا، دوسرا حضرت حسان کے بھائی حضرت عبدالرحمٰن کا اور تیسرا حضرت سعد بن ربیع کا۔ بالکل ممکن ہے کہ سعد بن ربیع کے علاوہ اور واقعے بھی اس قسم کے پیش آئے ہوں"۔ اور نزول آیات متعلقہ کا سبب بنے ہوں۔[۳۱] استاد و شاگرد کا آخری اختلاف حجۃ الوداع کے موقعہ پر خطبہ نبوی کے ضمن میں نظر آتا ہے جس کے بعض ضمنی الفاظ مصنف سیرت نے جامع کے خیال میں چھوڑ دیے ہیں۔[۳۲]

تبصرہ

سوانح رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف گوشوں اور نکتوں پر سیرت النبیؐ کے عظیم مصنف اور اس کے متبحر جامع کے اختلافات و استدراکات اور ان کے تقابلی مطالعہ سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ مصنف یا جامع کا نقطۂ نظر ہر ہر نکتہ یا ہر ہر معاملے پر لازمی طور سے صحیح یا غلط ہے۔ ایک غیر جانبدار، حقیقت کا جویا اور تحقیق کا طالب قاری یا تبصرہ نگار ان دونوں بزرگوں میں سے کسی ایک کی رائے کو ترجیح دینے کا حق رکھتا ہے، بلکہ وہ دونوں کی رائے سے اختلاف کر کے ایک تیسرے خیال یا نقطۂ نظر کو حقائق و واقعات کی روشنی میں

اپنا سکتا ہے۔ اگرچہ تحقیقات و نگارشاتِ شبلی پر سلیمانی تنقیدیں و استدراکات ایک مفصل تبصرہ کے متقاضی ہیں جو اس مختصر تجزیے کے دائرہ کار میں نہیں سما سکتے تاہم چند مختصر تنقیدی اشارے اور مبصرانہ جائزے ناگزیر معلوم ہوتے ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی پر بعض ناقدین کے مطابق معقولات اور کسی حد تک معاصر عقلیت پسندی اور تاریخی رومانیت کا غلبہ تھا جبکہ علامہ سید سلیمان ندوی دین متین کے محقق اور راسخ عالم سمجھے جاتے ہیں۔ اگر استاد و شاگرد کے طبعی رجحانات اور فکری میلانات کا قاری کو علم و اندازہ رہے تو ان دونوں عظیم مفکرین و مصنفین کے خیالات اور نگارشات کی نوعیت اور اور مزاج کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ علامہ شبلی کی یہی رومان پسندی ہے جو ان کو کبھی کبھی شخصیت پرستی تک لے جاتی ہے۔ چنانچہ انبیائے سابقین کے مقابلے میں جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جو بلاریب خاتم الانبیاء اور اکمل و افضل مخلوقات دنیا تھے تمام اوصاف و کمالات نبوت سے متصف دکھانے کی کوشش ان کو سرحدِ افراط تک لے گئی ہے جو عام قاری کو دوسرے انبیاء کے بارے میں غلط تاثر دے سکتی ہے۔ یہی رومانیت حضرت عمر فاروق کی تجویز اذان، حضرت علی اور ان کے والد ماجد ابوطالب بن عبدالمطلب ہاشمی کے قبولِ اسلام کے ضمن میں ان کی تحریروں میں جھلکتی ہے۔ شبلی کا جی چاہتا ہے کہ اذان کی تجویز کا سہرا اور فضیلت کی دستار حضرت عمر فاروق کے سر باندھیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد وہ ان کے سب سے بڑے اسلامی مبرد تھے۔ بنو ہاشم سے ان کی بیکراں محبت ان کو حضرت علی کو اولین مسلم قرار دینے پر ابھارتی ہے اور ابوطالب کی محبتِ رسولؐ اور ان کی جاں نثاریوں سے وہ اتنے متاثر و مغلوب ہیں کہ ان کو کسی نہ کسی طرح مسلمان ثابت کرنا چاہتے ہیں۔

بہرحال شبلی گرامی کے دفاع میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ رومان پسندی ان کے عہد کا فکری دھارا تھا۔ اور وہ غیروں کی دشنام طرازیوں کا جواب دے رہے تھے۔ شبلی مرحوم کی اس خوبی کا بھی اعتراف کرنا چاہیئے کہ انھوں نے عام طور سے اپنی پسندیدہ روایات اور اپنی فکر کی موید شہادات کے ساتھ ساتھ مخالف روایات و شواہد بھی دیے ہیں اور ان کو جرح و تعدیل کی کسوٹی پر کسنے کے بعد ہی مسترد کیا ہے۔ صرف ابوطالب کے قبولِ اسلام

کے بارے میں انھوں نے اپنے نظریے کی مخالف روایتوں سے اعماض کیا ہے کہ وہ ان کے پورے دعوے کی عمارت کو ہی منہدم کر دیتیں۔ علامہ ندوی نے اس کے برعکس پوری علمی اور فکری صلابت کے ساتھ متعلقہ امور پر مختلف روایات بیان کر کے مورخانہ غیر جانبداری کے ساتھ اپنے علم و یقین کے مطابق صحیح صورت حال پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ سید صاحب نے البتہ حضرت علی کے قبولِ اسلام والی روایت کے "وجوہ ضعف بلکہ وجوہ وضع" نہ بیان کر کے ہم تشنہ کاموں کی تشنگی کو اور بڑھا دیا ہے۔ دراصل سیرت نبوی کی تشکیل و تعمیر میں ابو طالب کے مقام و کردار کا ابھی تک تحقیقی تجزیہ نہیں کیا گیا ہے اور اس معاملے میں ہمارے تقریباً تمام سیرت نگار عہد عباسی کے عموماً ہاشمی نواز اور خصوصاً خاندان ابی طالب و عباس کی طرف میلان رکھنے والے مورخین و اہل سیر کی نگارشات سے اتنے متاثر و مبہوت ہیں کہ دوسری روایات کو بلا ارادہ و فکر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ تربیت و حمایت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا جو شرف کم از کم جنگ فجار اور حلف الفضول کے زمانے تک آپ کے عم اکبر زبیر بن عبد المطلب کو ملنا چاہیے[۳۳] وہ ان کے چھوٹے بھائی کی جھولی میں خاص مقاصد اور معلوم وجوہ سے ڈال دیا جاتا ہے۔ انھیں وجوہ و مقاصد سے حضرت علی کے قبول و سبقتِ اسلام کی مذکورہ بالا روایت پر جو اہل علم کے نزدیک سرتاپا موضوع ہے زور دیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خواب میں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے ذبح عظیم کے امر ربانی اور اس کی بعینہٖ تکمیل کی روایت پر اگرچہ استاد و شاگرد دونوں کو اپنے اپنے نقطۂ نظر کے لیے سلف کی تائید حاصل ہے تاہم یہ حقیقت ہے کہ استاد پر اپنے زمانے کی معقولیت پسندی کا غلبہ ہے کہ یہی نظریہ اس مکتب فکر کا تھا اور زمانہ بھی اسی کا مقتضی تھا جبکہ سید صاحب کا نظریہ جمہور قدامت پسند علماء کا ہے۔ تحقیق ثابت کرتی ہے کہ دونوں نظریات فکری عمل اور ردِ عمل کے نمائندے ہیں۔

غزوہ احد میں حضرت رافع بن خدیج کی جہاد میں شرکت کی اجازت نبوی اور حضرات شہداء پر نماز جنازہ کی ادائیگی کے معاملے میں استاد و شاگرد کے اختلافات کا اصل سبب یہ ہے کہ مصنف نے کسی ایک روایت پر کلی انحصار کر لیا ہے جبکہ جامع نے تمام روایات

کا استقصاء اور تجزیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف کا ایک المیہ یہ ہے کہ وہ اپنے ساختہ اصولِ تنقید کے بھی اسیر ہیں۔ انھوں نے فن تاریخ نگاری پر اپنی عالمانہ بحث میں یہ اصول وضع کر لیا ہے کہ اہل سیر کی روایات پر محدثین کی خاص کر صحیحین کی روایات کو ہر حال میں ترجیح حاصل ہوگی[۳۴] چنانچہ شہداء احد پر نماز جنازہ نہ پڑھنے کی روایت کو ترجیح بخاری کی روایت پر کلی تکیہ کا نتیجہ ہے۔ حضرت رافع کے بارے میں مصنف نے طبری پر ہی بھروسہ کر لیا ہے۔ شبلی کے دفاع میں کہا جا سکتا ہے کہ مرحوم کو وقت کی کمی کے سبب اپنی نگارشات پر تنقیدی نظر ڈالنے کا موقعہ نہیں مل سکا، جبکہ جامع ندوی کو یہ مواقع برابر حاصل رہے۔

مصنف سیرت نے اپنی معلوم روش کے برخلاف غزوۂ مریسیع کے باب میں اہل سیر کی روایات پر بھروسہ کیا ہے اور چونکہ صحاح کی روایات قبول کرنے سے سیرت نبوی پر حرف آتا ہے اس لیے موصوف نے ان روایات کی اسناد میں کلام کر کے مسترد کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ علامہ شبلی قدرتی طور پر امام بخاری اور امام مسلم جیسے ائمہ فن اور بزرگانِ حدیث کو بھی تنقید سے بچانا چاہتے تھے اس لیے ان کے رواۃ کو مورد الزام قرار دے دیا ہے یہ دوسری بات ہے کہ ایسی روایات قبول کرنے کی ذمہ داری پھر بھی ان پر عائد ہوتی ہے۔ اس کے برعکس مولانا ندوی کا المیہ یہ ہے کہ وہ رواۃ کرام و محدثین عظام کا دفاع کرتے ہیں تو چوٹ ذاتِ نبوی پر پڑتی ہے۔ دونوں اپنے اپنے حصاروں سے — خود ساختہ حصاروں سے — باہر آنے کو تیار نہیں۔ لہٰذا علامہ سید سلیمان ندوی نے ایک صلح کی صورت نکالی۔ محدثین کرام اور ان کے بزرگ راویوں کو بچا لیا اور نفسِ مسئلہ پر بحث سے احتراز کیا کہ بات دونوں طرح بن جائے۔ بہر حال تاریخی حقیقت یہی ہے کہ اہل سیر کی روایت کو اس باب خاص میں محدثین پر فضیلت حاصل ہے۔ ناقدین و علماء اصولِ حدیث کا اس اصول پر اتفاق ہے کہ ہر وہ روایت جس سے شانِ رسالت پر حرف آتا ہو یا جو آپ کی مسلمہ سیرت کے خلاف ہو مردود ہے[۳۵] کیونکہ تاریخی اور حدیثی مآخذ واشگاف اعلان کرتے ہیں کہ سنت نبوی اور اسلامی فوجی حکمت عملی یہی تھی کہ دشمن کو اچانک اور بے خبری میں جا لیا جائے[۳۶] تاکہ ان کو فرار یا تیاری کا موقعہ نہ ملے۔ فرار کی صورت میں ان کی فتنہ جوئی اور فساد فی الارض کا سدباب نہ کیا جا سکتا تھا اور تیاری کی صورت میں خون خرابہ سے امکانی

حد تک بچنا مشکل تھا۔ غزوۂ مریسیع میں بھی یہی حکمت عملی اپنائی گئی تھی۔[۳۷] صحیحین کی روایت کا مقصد بھی یہ نہیں معلوم ہوتا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو مصطلق پر اچانک حملہ کر کے ان کے افراد کو قتل یا قید کر لیا تھا بلکہ اچانک ان کو جا لیا تھا اور اس کے بعد جو کچھ پیش آیا اس کی تصریح اہل سیر کی روایت کرتی ہے۔ اگر دونوں مکاتب فکر کی روایات کا صحیح اور دقت نظر سے تجزیہ کیا جائے تو تطبیق کی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور وہ یہ ہے کہ راویوں کو اسلامی فوج کے اچانک مریسیع جا پہونچنے اور پھر حملہ کرنے کے درمیان جو وقفہ تھا اس کو بیان کرنے میں التباس ہو گیا ہے۔ لیکن یہ اسی صورت میں ہوگا جب تک یہ طے نہ کر لیا جائے کہ صحاح کی روایات کو ہر حال میں ترجیح حاصل ہوگی۔ معاملہ طرفداری کا نہیں، سخنوری کا ہونا چاہئے کہ اصل مقصود نہ روایاتِ سیرت ہیں اور نہ احادیث صحیحین، بلکہ وہ مقصود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔

غزوۂ احزاب میں حضرت زبیر بن عوام کو حواری رسول کا لقب دینے والی روایت کو علامہ شبلی نے اپنی اسی رومانیت کے سبب ترجیح دیا ہے جبکہ سید ندوی مرحوم نے تحقیق کا حق ادا کیا ہے کہ دونوں طرح کی روایات بیان کر دی ہیں۔ اس میں کوئی قباحت نہیں نظر آتی کہ دونوں صحابی اپنی اپنی خدمات کے لیے جو ایک جیسی ہی تھیں حواری رسول بننے کے مستحق تھے اور دونوں کو اس کا حق دار سمجھ لینے کی صورت میں کسی کے شرف میں کوئی شمہ برابر بھی کمی نہیں آتی۔ آخر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بھی تو بارہ حواری تھے!

غزوۂ خیبر کے باب میں حدیث نبوی کے الفاظ کے مصداق سیدھے سادے مسلمان تھے یا منافق؟ روایات کی تنقیح و تنقید اور تجزیہ علامہ شبلی کے حق میں توازن کے پلڑے کو جھکا دیتا ہے۔ سید صاحب قبلہ کی تنقید و تحقیق کی تصدیق تاریخی حقائق اور روایاتِ سیرت سے نہیں ہوتی ہے۔ یہ تقریباً متفق علیہ ہے کہ خیبر میں شرکائے حدیبیہ ہی کو شرکت کی اجازت ملی تھی جن میں کوئی بھی منافق نہ تھا۔[۳۸] علامہ شبلی نعمانی کی اس باب میں اس جگہ یا غزوات کے دوبارہ تجزیے کی بحث بڑی عالمانہ ہے اور حقیقت کے قریب بھی۔ حدیث نبوی کا مقصد نہ تو غزوہ کی معاشی اہمیت کو نظر انداز کرنا ہے اور نہ عام مسلم غازیوں کو طامع و حریص قرار دینا۔

بلکہ جہاد فی سبیل اللہ کے اولین و آخرین مقصد کو ذہنوں اور قلوب میں تازہ کرنا ہے جو دولت و غنیمت کے حصول کے تقریباً یقینی امکانات کی تاریکی میں ثانوی ہو چلا تھا۔ پھر روایات کا یہ بھی مقصد نہیں معلوم ہوتا کہ جہاد کے اصل مقصود پر پہلی بار صرف اس غزوہ میں زور دیا جا رہا تھا بلکہ یقینی فتح کے تصور نے ذکر اللہ اور ذکر اعلاء کلمۃ اللہ پر تذکرۂ دولت و غنیمت کو بعض حلقوں میں یک گونہ غلبہ بخش دیا تھا اور حدیثِ نبوی اسی بشری فروگذاشت پر متنبہ کرنے اور انسانی طبعی حرص و آز کو لگام دینے کی دراصل نبوی سرزنش تھی جو کارگر ہوئی اور مسلمان مجاہدین کے ذہن میں اعلاء کلمۃ اللہ کی مقصودیت اور مالِ غنیمت کی ثانویت اجاگر ہو گئی۔

غزوۂ مونہ کے باب میں استاد و شاگرد کے نقطۂ نظر کے اختلاف میں تاریخی حقائق استادِ گرامی کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں۔ محترم جامع نے مسلم مجاہدین کو "شکست و فرار" کی ذلت سے بچانے کی بالکل اسی طرح کوشش کی ہے جس طرح غزوہ خیبر کے بیان میں انھوں نے "طمع و حرص بشری" سے ان کو مبرا اور عاری قرار دینے کی کی تھی۔ مسلم عذر خواہوں کا ایک طبقہ ہمیشہ سلف و خلف میں رہا ہے جو "قومی شکست" یا "ملی ذلت" کو برداشت کرنے کی طاقت نہیں رکھتا یا ہمیشہ ان کو سرخرو و معزز دیکھنے کا عادی رہا ہے بلکہ بسا اوقات وہ ان کو بشری تقاضوں سے ماورا سمجھتا ہے۔ سید صاحب قبلہ کی تاویلات اسی جذبۂ مسلم کا اظہار ہیں اور انھوں نے جتنی روایات اپنی تائید میں پیش کی ہیں وہ اسی "مکتب عذر خواہی" کی نمائندہ ہیں۔ ورنہ تاریخی روایات اور حقائق فکر و نگاہِ شبلی کے موید و مصدق ہیں۔ البتہ غزوہ فتح مکہ کے موقعہ پر شہر مکہ میں مسلم فوج کے داخلے کی سمت کے معاملے میں مصنف مرحوم کی نگاہ سے چوک ہو گئی ہے جس کی بالکل صحیح گرفت ان کے جامع رشید نے کی ہے۔ مگر یہ حیرت کی بات ہے کہ دونوں عظیم مصنفوں نے اس باب میں اہل سیر و تاریخ کی روایات سے کلی طور پر احتراز و اغماض کیا ہے جبکہ مورخین کے نزدیک یہ قابل گرفت ہے۔ تاریخ دانوں کے مطابق اسلامی فوج شہرِ خدا میں صرف دو جانب سے نہیں، بلکہ چاروں سمتوں سے داخل ہوئی تھی[۳۹] رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس فوجی حکمت کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کی تابِ مقاومت ہی کو توڑ دیا جائے تاکہ خون خرابے کی نوبت نہ آنے پائے اور اس میں آپ کو تقریباً مکمل

کامیابی ہوئی تھی۔ حنین واوطاس وغیرہ کی جغرافیائی تشریحات میں البتہ جامع نے مصنف کی بجا طور پر گرفت کی ہے۔

غزوۂ حنین ہی میں مسلم فوج کے اول وہلہ یا دوم وہلہ میں عارضی شکست و فرار اور اس کے نتیجے میں ذات نبوی کے یکہ وتنہا رہ جانے کے سلسلہ میں استاد و شاگرد کی بحث بڑی دلچسپ ہونے کے ساتھ ساتھ دو مختلف خیالوں اور مکاتبِ فکر کی نمائندگی کرتی ہے۔ اگرچہ شبلی مرحوم نے حاشیہ کی عبارت میں بعض اصحابِ نبیؐ کی ثبات قدمی کی روایت کا حوالہ دیا ہے تاہم متن میں ثبات قدمی رسولؐ کو ممتاز و نمایاں قرار دینے کی ان کی رومان پسندی نے اس کی مخالف روایت کو اس کی صحیح جگہ نہیں دی ہے۔ حضرت جامع نے اس پر سیر حاصل بحث کرکے ممکنہ غلط فہمی کا سدباب کر دیا ہے۔ اسی طرح انھوں نے طلقاء مکہ کے اسلام اور عدم اسلام پر بحث کرکے مصنف کی عبارت میں ظاہری تضاد کی توجیہہ کر دی ہے۔ لیکن ان دونوں بزرگ سیرت نگاروں نے شکست و فرار کا ذمہ دار طلقاء مکہ کو قرار دے دیا ہے کہ وہی بے چارے حدید الایمان تھے اور اسی وجہ سے وہ راسخ العقیدہ اور ثابت قدم نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ المیہ ان دونوں بزرگوں کا نہیں بلکہ تمام مسلم مفکرین اور مورخین کا ہے۔ تاریخی روایات سے کسی طرح یہ ثابت نہیں ہوتا کہ طلقاء مکہ اور ان کا "ایمان واسلام تو" اس عارضی اور اول وہلہ کی شکست و فرار کا ذمہ دار تھا۔ تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ فرار و شکست کا آغاز بنو سُلَیم پر مشتمل مقدمۂ لشکر نبوی جو راسخ العقیدہ مسلمانوں پر مبنی اور حضرت خالد بن ولید مخزومی جیسے عظیم ماہر حرب کے زیر کمان تھا کے اچانک دشمنوں کی تیر اندازی کی زد میں آجانے اور نرغۂ اعداء میں گھر جانے کے سبب فطری تقاضوں سے ہوا تھا[۵۹]۔ وہاں صلابت ایمانی یا راسخ العقیدہ ہونے کا مسئلہ نہ تھا۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ غزوۂ احد میں مسلم تیر اندازوں کے غالب طبقے کے اپنے مقام کو چھوڑ دینے کے سبب مسلمانوں کو ــــ راسخ العقیدہ اور پکے مسلمانوں کو۔ ہزیمت ہوئی تھی۔ اس میں مسلم تیر اندازوں کی فوجی حکمت عملی کی غلطی تھی نہ صلابت ایمانی کی کمی۔ پھر غزوہ حنین کے ذیل میں سب سے بڑی شہادت خود کلام الٰہی کی ہے جو "فرار و شکست" کو برتر قوت وطاقت پر بے جا ناز و نازش اور کثرت تعداد پر انحصار کلی کو اصل

سبب قرار دے کر عام مسلمانوں کو اس کے لیے ذمہ دار ٹھہراتا ہے۔[۱۴۱]

واقعۂ ایلاء، حج ابوبکر اور لفظ غنیمت کی لغوی تحقیق کے سلسلہ میں استاد و شاگرد کے اختلافات زیادہ اہم نہیں ہیں۔ البتہ جنوبی عرب / یمن میں حضرات خالد بن ولید مخزومی اور علی بن ابی طالب ہاشمی کی مہمات دین و تبلیغ پر ان دونوں بزرگوں کی تحقیقات ایک غیر جانبدار مبصر کو ایک نئے زاویۂ فکر کی جانب لے جاتی ہیں۔ جامع مرحوم نے روایات کی معمولی جزئیات سے اختلاف کرنے کے باوجود بہر کیف اپنے استاد محترم کی اس رائے سے اتفاق کیا ہے کہ یمن میں حضرت خالد بن ولید مخزومی کی تبلیغی مہم ناکام رہی تھی اور اس ناکامی کو کامیابی سے بدلنے کا سہرا حضرت علی بن ابی طالب ہاشمی کے سر تھا۔ اس باب میں استاد کو ان کی رومانیت کے علاوہ محدثین کی روایات پر یک طرفہ و جانبدارانہ انحصار نے اس نتیجہ تک پہونچنے میں مدد دی ہے۔ جامع ندوی نے بھی دوسری تمام روایات کو یکسر نظر انداز یا مرجوح قرار دے کر طرفداری کا معاملہ کیا ہے اور اسی لیے وہ اپنے استاد کے نتیجے سے متفق ہو گئے ہیں۔ ورنہ اگر تمام روایات کی تنقیح و تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرات خالد و علی دونوں کے تبلیغی مشن پوری طرح سے کامیاب رہے تھے۔ دراصل ان دونوں بزرگ و عظیم صحابہ کرام کی جولان گاہیں اور میدانِ کار الگ الگ تھے۔ جنوبی قبائل کے ناموں کی یکسانیت نے نہ صرف مصنف اور ان کے جامع کو بلکہ ان کی قبول کردہ روایاتِ حدیث کے راویوں کو بھی مغالطہ دیا ہے۔ تاریخی روایات سے واضح ہوتا ہے کہ حضرت خالد کی جولان گاہ مذحج کی ایک شاخ بنو عبدالمدان تھی جبکہ حضرت علی کی تبلیغ گاہ قبیلہ مذحج کا دوسرا علاقہ۔[۱۴۲] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے سے قائم شدہ نظریات، طبعی میلانات اور بشری رجحانات کس طرح دھوکہ اور مغالطہ دیتے ہیں۔ بقیہ معاملات میں استاد و شاگرد دونوں اپنے اپنے دعووں، نظریوں اور خیالات کے ثبوت و تائید میں تاریخی اور حدیثی روایات رکھتے ہیں۔ اور ایک قاری یا مبصر ان میں سے کسی سے اتفاق یا اختلاف کر سکتا ہے۔

آخر میں اس خاکسار و خادم تبصرہ نگار کا فرض ہے کہ وہ اعتراف کرے کہ وہ فیضِ عام شبلی اور فیضانِ سلیمانی کا مرہونِ منت اور ان دونوں بزرگوں کے وابستگانِ دولت کا پروردہ

ہے۔ اس کا یہ بھی اعتراف و یقین ہے کہ ان تسامحات، استدراکات اور تبصروں کے باوجود مصنف شبلی نعمانی اور جامع سلیمان ندوی کی "سیرت النبیؐ" ابھی تک اردو، عربی اور انگریزی میں موجود موادِ سیرت کی صفِ اوّل میں بھی سر فہرست ہے۔ کم از کم اردو اور عربی میں تقریباً ستّر سال گذر جانے کے باوجود اس سے بہتر سیرتِ نبوی پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ وہ اپنی تحقیق و تدقیق، ترتیب و تبویب، بحث و تمحیص، تنقید و تنقیح، زبان و بیان، اسلوب و ادا اور ان سے سے بڑھ کر تاریخی معیار سے ابھی تک "اوّلین سیرت نبوی" ہے اور غالباً مدت تک اس پر کوئی اہم اضافہ نہیں کیا جاسکے گا۔ اور یہ یقینی ہے کہ جو بھی اور جب بھی اضافہ ہوگا اس کی تعمیر و تشکیل میں خونِ شبلی اور جگر کاوی سلیمانی کی پختہ بنیاد ضرور ہوگی خواہ منکرینِ حق اس فیضِ عام کو مانیں یا نہ مانیں۔ باقی رہا تنقید و تبصرہ و استدراک کا حق تو ہر شخص کو دیانت کے ساتھ حاصل ہے کہ کوئی بھی بشری کاوش یا انسانی تحریر اس سے مستثنیٰ نہیں۔ یہ طرۂ امتیاز تو صرف کلامِ الٰہی اور کلامِ رسولؐ کو حاصل ہے جس میں کسی کمی، اشتباہ اور باطل کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

حواشی و تعلیقات

۱ شبلی نعمانی، سیرت النبیؐ، مرتبہ سید سلیمان ندوی، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۶ء جلد اول ص۱ دیباچہ
۲ ایضاً ۳ ایضاً ص۲ ۴ اصل کتاب مصنف ص۲ ۵ اصل کتاب ص۲-۹، حاشیہ ۱
مزید تفصیل کے لیے معارف، محرم - صفر ۱۳۵۶ھ میں مضمون خلیل کی بشریت کا حوالہ۔
۶ اصل کتاب ص۱۴۵ اور ص۱۴۵-۸ کا حاشیہ ۱ ۷ اصل کتاب ص۱۵۴ اور حاشیہ ۱
۸ اصل کتاب ص۱۹۶ نیز ص۱۹۵-۶ کا حاشیہ ۱ ۹ اصل کتاب ص۲۱۱ اور حاشیہ ۱
۱۰ اصل کتاب ص۲۱۲ میں کتاب کا متن اور قوسین کی عبارت ۱۱ اصل کتاب ص۲۴۷-۹
۱۲ " ص۲۴۷ پر حاشیہ ۲ ۱۳ اصل کتاب ص۲۴۸ حاشیہ ۲
۱۴ " ص۲۸۲ اور ص۲۸۲-۳ کا حاشیہ ۳ ۱۵ اصل کتاب ص۳۷۳ اور حاشیہ ۱
۱۶ " ص۳۸۵ اور حاشیہ ۱ ۱۷ اصل کتاب ص۴۱۵ اور حاشیہ ۱ ۱۸ اصل کتاب ص۴۲۵ اور حاشیہ ۱

۱۹؎ اصل کتاب ص۴۸۱ اور حاشیہ ۱ ۲۰؎ اصل کتاب ص۵۰۲ اور ص۵۰۷-۸ کا حاشیہ ۱۲

۲۱؎ " ص۵۱۵ اور حاشیہ ۲ ۲۲؎ " ص۵۲۰ اور حاشیہ ۲

۲۳؎ " ص۵۳۴ نیز ص۵۳۵-۸ کا حاشیہ ۱۲ ۲۴؎ " ص۵۳۷ اور حاشیہ ۱

۲۵؎ " ص۵۵۶ اور حاشیہ ۲ ۲۶؎ اصل کتاب ص۵۶۹ اور حاشیہ ۲

۲۷؎ " ص۵۷۰ اور حاشیہ ۱ (س) ۲۸؎ " ص۵۷۵ اور حاشیہ ۱

۲۹؎ سیرت النبی، مطبع معارف اعظم گڑھ ۱۹۷۳ء، جلد دوم ص۲۸

۳۰؎ " ص۱۱۲ اور حاشیہ ۱ ۳۱؎ سیرت النبیؐ ص۱۳۰ اور حاشیہ ۱

۳۲؎ " ص۱۵۴ اور حاشیہ ۳ ۳۳؎ ملاحظہ کیجیے احمد بن یحییٰ بلاذری، کتاب الاشراف، اول، مرتبہ محمد حمید اللہ، قاہرہ ۱۹۵۹ء، ص۲۸۰ ۳۴؎ سیرت النبیؐ، اول ص۸۴

۳۵؎ ملاحظہ ہو مولانا سید محمد متین ہاشمی، اقوال رسول صلی اللہ علیہ وسلم، نقوش لاہور ۱۹۸۴ء رسول نمبر جلد ششم ص۲۶۳-۶۴

۳۶؎ بحث کے لیے ملاحظہ ہو محمد یٰسین مظہر صدیقی، عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت نقوش، لاہور ۱۹۸۳ء، رسول نمبر جلد پنجم ص۵۶۱ وغیرہ۔

۳۷؎ عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، ص۳۸۲-۳ اور ص۵۳۴

۳۸؎ عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، ص۳۸۶ اور ص۳۸۹۔ نیز ملاحظہ ہو احمد بن یحییٰ بلاذری، فتوح البلدان، قاہرہ ۱۹۳۸ء، ص۲۴ جس کے مطابق خیبر کے مجاہدین کی تعداد پندرہ اسی تھی اور ان میں سے پندرہ سو چالیس شرکائے حدیبیہ تھے۔

۳۹؎ عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، ص۵۴۳-۴۔ نیز ملاحظہ ہو ابن اسحاق، سیرت رسول اللہ انگریزی ترجمہ از الفریڈ گلیوم، لندن ۱۹۵۵ء ص۵۴۹

۴۰؎ ایضاً ص۳۹۲ نیز ملاحظہ ہو واقدی، کتاب المغازی، مرتبہ مارسدن جونس، آکسفورڈ ۱۹۶۶ء ص۸۸۵-۹۲۲، مونٹگمری واٹ، محمد ایٹ مدینہ، آکسفورڈ پریس ۱۹۵۵ء ص۷۲

۴۱؎ قرآن کریم، سورہ توبہ ۴۰۔ نیز سیرت النبیؐ، اول ص۵۳۲-۴

۴۲؎ عہد نبوی میں تنظیم ریاست وحکومت، ص۵۰۴